عہدِ حاضر میں تربیت و کردار سازی کے تقاضے اور فکرِ اقبال کی معنویت
The Requirements of Character Building in the Present Era and the Significance of Iqbal's Thoughts

شائستہ اعوان [i]

Abstract:

In every era, the importance of training and character building of the members of the society has been there. In the present material age, its importance and need has become even greater because as the development is increasing day by day in every field of life, human society is getting morally degraded. We are fortunate that, as a nation, we have a great personality like the thinker of Pakistan, whose thoughts and ideas continue to guide us even today. The universality of Iqbal's thought is a light for us even now and in the future era. The thoughts of Iqbal are the thoughts of every age because their basis is the insightful thoughts contained in the Holy Qur'an. Iqbal has the training and character-building equipment of every member of the Muslim Ummah. There is no doubt that if we, as a nation, make Iqbal's thoughts and ideas a part of our character both theoretically and practically, then we can regain our Identity.

Keywords: *Character building, Development, Affordability, Life struggle, Actions.*

ہر دور میں افرادِ معاشرہ کی تربیت اور کردار سازی کی اہمیت رہی ہے۔ موجودہ مادی دورمیں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کیوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں جوں جوں روز افزوں ترقی ہوتی جارہی ہے توں توں انسانی معاشرت اخلاقی اعتبار سے پستی کا شکار ہو رہی ہے۔ ہم اس بنا پر خوش قسمت ہیں کہ بحیثیت قوم ہمیں مفکرِ پاکستان جیسی عظیم ہستی میسر ہے جن کے افکار اور خیالات آج بھی ہماری رہبری و رہنمائی کر رہے ہیں۔ اقبال کے فکر کی آفاقیت اور ہمہ گیری اب بھی اور آنے والے دور میں بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ افکارِ اقبال ہر دورکے افکار ہیں اس لیے کہ ان کی بنیاد قرآنِ حکیم میں موجود بصیرت آموز افکار ہیں۔ اقبال کے ہاں اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کی تربیت و کردار سازی کا سامان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم ایک قوم کی حیثیت سے اقبال کے افکار ونظریات کو نظری اور عملی طور پر اپنے کردار کا حصہ بنائیں تو ہم اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر سے پا سکتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: کردار سازی ، تشکیل ، استطاعت ، کشمکشِ حیات ، حرکت و عمل ، جبلت۔

افرادِ معاشرہ کی تربیت اور کردار سازی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ تربیت اور کردار سازی سے مراد جملہ خصوصیات اور محاسن کے مطابق شخصیت کو ڈھالنا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تربیت کی ضرورت کیوں ہے ؟ تربیت کون کرتا ہے اور کیا وہ اس کا اہل ہے بھی یا نہیں؟ کیا ہر جگہ ، خطے اور معاشرے میں ایک ہی طرح سے تربیت کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جوابات مختلف آرا اور خیالات پر مبنی ہو سکتے ہیں کیوں کہ ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جب ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کی پسند ناپسند ایک جیسی نہیں۔ حالات و واقعات یکساں نہیں۔ اسے ایک جیسی صلاحیتیں ودیعت نہیں ہوئیں تو پھر تربیت و کردار سازی کے حوالے سے ایک جیسے معیارات کا تعین کر لینا کہ ان خطوط پر افراد کی رہنمائی کی جائے گی۔ اس سوچ پر عمل کرنا نہایت ہی مشکل امر ثابت ہو گا۔ تاہم جب ہم کسی خاص گروہ یا

[i] انسٹرکٹر (اردو)، انٹرنیشنل بیکولوریٹ ڈپلوما پروگرام ، بیکن ہاؤس نیولینڈز ڈیفنس ، لاہور۔ (Corresponding Author)

معاشرے کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہر معاشرہ اپنے افراد کی تربیت و کردار سازی کے لیے کچھ ترجیحات طے کرتا ہے۔ کچھ قاعدے قانون وضع کرتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی ایک الگ شناخت قائم کرتا ہے۔ ہم پاکستانی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری اپنی الگ شناخت اور پہچان ہے۔ ہمارے عظیم رہنماؤں نے مسلمانانِ برصغیر کے ساتھ مل کر انتہائی سختیاں اور مشکلات جھیل کر، ہزاروں جانوں کا نذرانہ پیش کرکے پاکستان حاصل کیا ہے۔ ان عظیم رہنماؤں میں ایک اہم نام علامہ محمد اقبال کا ہے۔ وطنِ عزیز مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال کے فکر کی تصویر اور خواب کی تعبیر ہے۔ علامہ اقبال وہ عظیم اور نابغہ ہستی ہیں جن کا ایک عالم معترف ہے۔ اقبال ہمارے رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر، عالم اور فلسفی ہیں۔ انھوں نے اپنی علمی اور فلسفیانہ جہتوں کو اپنی شاعری میں جذب کیا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآنِ حکیم سے رہ نما اصول لے کر ایک مستقل نظامِ فکر ترتیب دیا اور اس نظامِ فکر کا بہترین اظہار شاعری میں کیا۔ اقبال کی شاعری سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس عظیم پیغام کا مقصد صرف اور صرف اصلاح فرد و معاشرہ اور ملت تھا اور ان کی شاعری ارتقا کی مختلف منازل سے گزری ہے۔ فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں:

> اگر اقبال قیامِ پاکستان تک زندہ رہتے (جو ان کی تجریدی اور مبہم سیاسی تصور کی تشکیل ہے) تو یقیناً ان کا ذہنی ارتقا ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا ہوتا اور وہ اس نظریے کی بنیاد رکھتے جسے پاکستانی قومیت کہا جا سکتا ہے۔[1]

اقبال کی وفات اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہو چکی تھی اور بقول ڈاکٹر جاوید اقبال اگر وہ قیامِ پاکستان کے وقت حیات ہوتے تو ان کا ارتقا پسند ذہن نئے مراحل طے کرتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست کہ آج ہمیں ان افکار و نظریات کی شدت سے ضرورت ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت یا فوری بعد ایک ارتقا کے طور پر اقبال کے ہاں نظر آتے تاہم، ہم ابھی بھی خوش قسمت ہیں کہ اقبال کے افکار و نظریات ہماری تربیت اور کردار سازی کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے۔ اسی حضرتِ انسان کی اصلاح و فلاح کو وہ مقدم سمجھتے ہیں اور محبت و اخوت کی سربلندی کو زندگی کا مطمحِ نظر سمجھتے ہیں: یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی،اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کہتے ہیں:

> اقبال کی انسانیت کا محرک و مقصود صرف ایک جذبہ ہے، بنی نوع انسان کی ہمدردی اور یہ

> چیز سراسر اخلاقی یا زیادہ گہرائیوں میں جائیں تو ایک روحانی جوہر ہے اور اگر اس جوہر کو کوئی ٹھوس نام دینا چاہیں یا اسے ایک ضابطے کے تحت لا کر دیکھنا چاہیں تو کہیں گے کہ اس ہمدردی کا جذبہ مذہبی ہے خاص کر اقبال کے سلسلے میں تو مذہب کی تخصیص بھی اسلام کے نام سے کر دی جا سکتی ہے۔[۲]

اقبال نے اسلامی فکر کو بنیاد بناتے ہوئے معاشرے کے ہر فرد اور طبقے کی رہنمائی کی ہے۔ انھوں نے عصرِ حاضر کے عقائد و تخیلات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ کلامِ اقبال جس حوالے سے معاشرے کی مختلف اکائیوں، طبقوں یا افراد کی تربیت کرتا ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے بعد ان صورتوں اور طریقِ کار پر روشنی ڈالی جائے گی جنھیں اقبال تربیت اور کردار سازی میں معاون سمجھتے ہیں۔ اقبال کے افکار میں بچوں، نوجوانوں اور خواتین، طالبِ علموں، اساتذہ کی تربیت اور کردار سازی کا رجحان نمایاں طور پر ملتا ہے۔

بچے مستقبل میں قوم کے معمار ہوتے ہیں، اگر اُنھیں صحیح تربیت دی جائے تو اس کا مطلب ہے ایک اچھے اور مضبوط معاشرے کے لیے ایک صحیح بنیاد ڈال دی گئی۔ بچوں کی اچھی تربیت سے ایک مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے کہ ایک اچھا پودا ہی مستقبل میں تناور درخت بن سکتا ہے۔ اقبال نے بھی اسی جذبے اور ضرورت کے پیشِ نظر قوم کے اس اہم جزو کو نظر انداز نہیں کیا۔ روز مرہ زندگی اور مشاہدے کی ایسی عام باتوں، نکتوں اور مثالوں کو بچوں کے لیے پیش کیا جو ان کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جن پر وہ اپنی فہم کے مطابق غور و فکر کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکیں۔ کلامِ اقبال میں کئی نظمیں بچوں کے لیے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں اقبال بچوں کی نفسیات ور اخلاقیات کے پہلو کو بطورِ خاص مدِ نظر رکھتے ہیں۔ آج ہمارے ہاں بچوں کی دلچسپی اور مصروفیت ڈیجیٹل اور ویڈیو گیمز سے شروع اور انھیں پر ختم ہوتی ہے۔ اسلحہ، بندوق اور بم دھماکوں سے بھرپور جنگی معرکے گیمز کی صورت میں آن لائن کھیلے جاتے ہیں۔ قتل و غارت کی فضا نفسیاتی اور ذہنی طور پر بچوں کو مفلوج بنا رہی ہے اس پس منظر میں اقبال کی نظم ''طفلِ شیر خوار'' کا آغاز دیکھیں تو لگتا ہے کہ وہ اپنے دور میں رہتے ہوئے آئندہ آنے والے وقت کی منظر کشی اور پیش بندی کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو　　　مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نووارِدِ اقلیمِ غم　　چبھ نہ جائے دیکھنا، باریک ہے نوکِ قلم
آہ! کیوں! دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے　　کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ آزار ہے

گویا اقبال آگاہ ہیں کہ طفلِ شیر خوار کی رہنمائی کن اصولوں کے پیشِ نظر ہو سکتی ہے بچے جو ناسمجھ ہیں اور وہ اس بات سے عاری ہیں کہ کون سی چیز ان کے فائدے کے لیے ہے اور کس چیز سے ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور ایسے میں ان کے خیر خواہ اور ہمدرد ان سے چاقو چھین کر کاغذ کے ٹکرے سے کھیلنے کا کہتے ہیں کہ اس میں اسے تکلیف نہ ہو گی۔ اقبال "ایک مکڑا اور مکھی"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "بچے کی دعا"، "ہمدردی"، "پرندے کی فریاد" جیسی نظمیں لکھ کر نونہالانِ امت کی تربیت اس طرح کر رہے ہیں کہ وہ دوسروں کے مددگار اور ہمدرد ہوں۔ دوسروں کی مدد اور تعاون کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ دنیا کی کسی شے کو بے کار اور حقیر نہ سمجھیں تا کہ غرور اور تکبر ان کے مزاج میں شامل نہ ہو۔ اسی طرح "پرندے کی فریاد" در حقیقت امت ہی کی فریاد ہے جس کے ذریعے اقبال بچوں کو پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہر کوئی پرندے کی طرح آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔ آزادی کی بہار ہی نرالی ہے۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ قید ہونا محض پرندے کے لیے ہی تکلیف دہ اور جان لیوا نہیں بلکہ ہر ذی روح کے لیے اذیت ناک ہے۔ اسی لیے پرندے کی سوچ کو یوں زبان عطا کرتے ہیں:

اس قید میں الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

اقبال اپنے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کے حوالے سے بھی غافل نہ تھے۔ چوں کہ ایک بڑے اور نامور آدمی کی زندگی کے مختلف گوشے اور پہلو بھی رہنمائی کا کام سرانجام دیتے ہیں اسی طرح اقبال کی صاحبزادی منیرہ صلاح الدین اپنی بچپن کی ایک یاد تازہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> حضرت علامہ کی وفات کے وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مسز ڈروس احمد جو ایک جرمن خاتون ہیں، میری والدہ محترمہ کی وفات کے بعد انھوں نے ہی ہم دونوں بہن بھائیوں کو ایک مشفق ماں کی طرح پالا۔ ہماری دیکھ بھال کے علاوہ تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتی تھیں۔ ان کی حیثیت ہمارے گھر میں ایک فرد کی سی تھی۔ ایک دفعہ میں نے برجستہ انھیں کلمہ شریف سنانے کے لیے کہا، مسز ڈروس احمد نے نفی میں سر ہلایا، تب میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے ابا جان نے مجھے پیار سے اپنے پاس بلایا اور پیار

کرتے ہوئے کہا ’ہاں ہاں منیرہ تم انھیں کلمہ شریف سناؤ‘۔[۳]

جہاں اقبال کے ہاں بچوں کی تربیت اور اخلاق و کردار کی تشکیل پر توجہ ہے وہاں وہ نوجوانوں کی تربیت کے لیے بھی یہی دلی احساس رکھتے ہیں۔ وہ نوجوانوں سے بے داغ کردار کے خواہاں ہیں ایسا نوجوان جس سے باطل کی قوتیں پاش پاش ہو جائیں۔ اس کی جواں مردی دین وملت کے لیے سربلندی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس کا دل عشقِ حقیقی سے منور ہو ایسے لوگوں کو اللہ پاک وہ بلند و بالا مقام و مرتبہ عطافرماتا ہے کہ انھیں دنیا سے لاپرواکر دیتا ہے۔ ان کا فقر حیدری اور کراری صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ بظاہر ان کی خستہ حالی ان کا حقیقی سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہی خستہ حالی ان کے سر کا تاج اور چہرے کا نور بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا　　　شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی　　　کہ یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

حیا اسلامی معاشرے کا خاصہ ہے جو معاشرہ شرم و حیا سے آراستہ ہو وہاں ذہنی آسودگی اور عزت و احترام کی فضا جنم لیتی ہے۔ شرم و حیا، عفت و پاکیزگی ایک مسلمان کی بنیادی شناخت اور اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ اسلام نے جو معاشرتی نظام تشکیل دیا ہے، اس میں شرم و حیا اور عفت و پاکیزگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شرم و حیا سے دوری نفس کی اصلاح کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور یہ عمل انسان کے باطن کے لیے تباہ کن ہے اور انسان کے باطن کو خراب کرنے میں اس کا بہت دخل ہے۔ جب تک اس عمل کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک باطن کی اصلاح کا تصور محال ہے، نظر کی حفاظت کے بعد ہی انسان کو رتبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:-

حیاء بھی ایمان کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ [بخاری، مسلم]

اچھی صحبت اختیار کرنے سے انسان خیر اور بھلائی میں رہتا ہے جبکہ بری صحبت اختیار کرنے سے انسان خسارہ میں ہی رہتا ہے۔ اسی لیے نوجوانوں میں بلند کرداری اور اچھی صحبت کے نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ”جاوید کے نام“ نظم میں لکھتے ہیں:

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی　　　خراب کر گئی شاہیں بچے کو تربیتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی　　　خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

بظاہر یہ نظم جاوید کے نام لکھی ہے لیکن اس کا مخاطب در حقیقت قوم کا ہر نوجوان ہے۔ اقبال

جانتے تھے کہ نوجوانوں کے دلوں میں امنگوں کے جذبات اور قربانیوں کے ولولے موج زن ہوتے ہیں اور وہ ہر نئے پیغام کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اقبال جانتے تھے کہ اقوامِ غیر نے انھیں نوجوانوں کو بھٹکا کر مشرق سے ابھرنے والے آفتاب کی کرنوں سے مغرب کو منور کر کے مشرق سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ اقبال کی خواہش تھی کہ قوم و ملت کے نوجوان ایک دفعہ بیدار ہو جائیں تو پھر غیر قوم ان پر مسلط نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنا یہی جذبہ اور عشق ان نوجوانوں میں منتقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

طلبِ علم عین عبادت ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ اقبال کا دور رس ذہن طلبِ علم میں سر گرداں لوگوں کے لیے اپنے فکر کے موتی نہ لٹاتا۔ اقبال قوم کے طالبِ علموں کی تربیت کس طرح کرتے ہیں اور انھیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کے ان اشعار سے ظاہر ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

گویا اصل بات صاحبِ کتاب ہونا ہے اور یہ شرف اور اہلیت تبھی پیدا ہو گی۔ جب دل میں اضطراب پیدا ہو اور کسی طوفان کا سامنا ہو اقبال کے نزدیک علم صرف کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ اس میں موجود پیغام کے معانی و مطالب تک رسائی اصل مقصدِ حیات ہے۔ اقبال اسی کا خواہش مند نظر آتے ہیں۔ علم کی ترسیل کا ایک ذریعہ کتاب ضرور ہے۔ کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مگر اقبال کے نزدیک علم ابن الکتاب ہے جبکہ عشق ام الکتاب ہے۔ محض کتاب خوانی زندگی گزارنے کے گُر نہیں سکھا سکتی۔ اس کے لیے غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ کانٹوں بھرے راستوں پر چلنا پڑتا ہے۔ مشکل ترین حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سود و زیاں کے فریب سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ:۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

چوں کہ اقبال کے نزدیک زندگی جہدِ پیہم کا نام ہے لہٰذا ان کی رائے میں تعلیم کا مقصد محض ذہنی

برتری کی تربیت کے بجائے کشمکشِ حیات کی تیاری کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> آئینِ حیات کیا ہے؟ مسلسل جدوجہد۔ پھر تعلیم کا انجام کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کے لیے تیاری۔ جو قوم محض ذہنی برتری کے لیے عمل پیرا ہے وہ اس ذریعے سے اپنی کمزوری کا اظہار کرتی ہے۔[۴]

اسی طرح کتب خانے کے بڑے ہونے کے حوالے سے بھی ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں:

> اگر آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ ہے اور اس میں موجود تمام کتب کے بارے میں آپ جانتے ہیں تو یہ صرف ظاہر کرتا ہے کہ آپ ایک امیر آدمی ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ ایک مفکر بھی ہوں۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا صرف یہ مطلب ہے کہ آپ کے پاس استطاعت ہے کہ زیادہ لوگوں کی فکری خدمات حاصل کر سکیں۔[۵]

ایک اور صورتِ حال جس کا آج کل ہمیں سامنا ہے وہ یہ کہ تعلیم اور تعلیمی اداروں کا ایک بڑا مقصد فکرِ معاش کا حل ہے۔ ہمارے ہاں کئی ایسے نام ور ادارے موجود ہیں جن سے فارغ التحصیل ہونا ہی ملازمت کا حصول یقینی بناتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کیا محض ملازمت کا حصول ہے؟ یا شخصیت کی تعمیر؟ کیا نوجوان کردار اور شخصیت کی تعمیر کے لیے تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ دراصل آج کے دور میں ان ہی مضامین یا ڈگریز کو حاصل کیا جا رہا ہے جو ملازمت کے حصول میں فائدہ مند ثابت ہوں۔ ہمارے ارد گرد ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ شعر و ادب، فلسفہ حتیٰ کہ تاریخ تک کی تعلیم کو آج کل غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ آج اس مادی دور میں سوچنے سمجھنے پر وقت صرف کرنے کی گنجائش نہیں مگر اقبال آج سے سو سال پہلے بھی یہی پیغام دے رہے ہیں اور نہ صرف عصرِ حاضر کے اس مسئلے کی نشان دہی کی بلکہ اس کا حل بھی بتایا کہ:۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اقبال کے نزدیک زندگی کی تعلیم زندگی کے قرب میں ہے۔ زندگی کے قریب تر ہونے میں ہے۔ یا یوں کہیے کہ زندگی کو گزارنے میں، اس پر غور و فکر میں، سوچ، سمجھ اور شعور کی بیداری میں ہے۔ نیچر میں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

ضربِ کلیم کی ایک غزل میں کہتے ہیں:

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

محض کتابی علم نہیں بلکہ زندگی کے قریب ہونا ضروری ہے سیدھی سی بات ہے کہ جو علم محض دماغی و عقلی سرمایہ ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ شخصیت میں انقلاب یقین کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ کسی اعلیٰ اصول پر یقین جس قدر محکم ہوگا۔ اسی قدر اس کا اثر خرد پر زیادہ ہوگا۔ بظاہر علم سے فقط معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے عمل کے لیے خود بخود راہ نہیں کھلتی۔ اگر وہ معلومات مثبت قدروں کی بحالی اور تقویت کا باعث بن سکتی ہوں تو انسانیت کی نسبت سے مفید ہیں ورنہ غیر مفید، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اسے اپنے ملک کے پورے جغرافیے سے بخوبی آگاہی حاصل ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ محبِ وطن بھی ہے۔ علم سے فہم کے راستے کھلتے ہیں۔ مگر اخلاقی تربیت بہر حال معلومات سے الگ چیز ہے۔ اگر وہ تربیت حاصل نہ ہو تو کسی کے علم کی وسعت اور گہرائی اس کے اچھا انسان ہونے کی نہ دلیل ہے اور نہ ضمانت۔ بڑا عالم ہونا اور بات ہے اور بڑا آدمی ہونا اور بات ہے۔ عقلی اور نظری سطح پر رہ جانے والا علم بسا اوقات انسانیت کُش ثابت ہوتا ہے۔ وہ ان معنوں میں کہ غیر تربیت یافتہ کی منہ زور جبلتیں اپنی وحشت کے نفاذ کے لیے علم و آگاہی کو اوزار اور ہتھیار بنا لیتی ہیں۔ علم ایک غیر جانبدار قوت ہے۔ اگر اس قوت کا استعمال کرنے والا اچھا انسان ہے تو وہ قوت مفید ثابت ہو سکتی ہے اور اگر قوت کا استعمال کرنے والا برا ہے تو وہ قوت مضر رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اقبال نے اسی بات کو ابراہیمی حوالے سے ان الفاظ میں سمجھایا کہ:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ براہیم
کیا ہو جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی رہنمائی بھی کلامِ اقبال میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ جب تک اساتذہ خود علوم سے آراستہ نہیں وہ کیسے طلبہ کو علوم سے مکمل طور پر روشناس کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو یہ

صلاحیت رکھتے تھے اہلِ علم تھے۔ رہنمائی کر سکتے تھے وہ بھی گردشِ زمانہ کا شکار ہو کر زمانے کے اسیر ہو کر رہ گئے چناں چہ ایسی ناگہاں صورتِ حال میں لوگوں کی تربیت کافریضہ کون سرانجام دے گا:

مقصد ہو اگر تربیتِ لعل و بدخشاں بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار کیا مدرسہ، کیا مدرسے والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اچھے استاد کی صفت یہ ہے کہ وہ طالب علم میں شوق اور علم کے لیے تجسّس پیدا کرے یہ تجسّس ہی تحقیق و تخلیق کا منبع ہے۔ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کی ایسی تربیت کریں جو ان میں سوچنے، تصور کرنے اور تجزیہ کرنے کی خوبیوں کو چمکا دے۔ کسی خیال یا مفروضہ کے بارے میں سوال یا استدلال استاد اور طلبہ کے درمیان خوشگوار انداز میں تبادلہ خیالات کا ذریعہ بنے۔ امکانات اور سوچ کے نئے نئے در واہوں اور علم و ہنر کی گمشدہ میراث کو اپنی جستجو اور لگن سے دوبارہ پالیں۔ چوں کہ تعلیم کا مقصد نئ نسل کو بہتر زندگی گزارنے کے لیے مستقبل کے مسائل اور حقائق کو سمجھنے اور اپنے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کی مناسب تربیت ہے۔ ایسے میں استاد کی ذمہ داری ہلے کہ وہ تدریس کے دوران فلسفیانہ اور عملی حیثیت کی پہچان کروادے۔ جو طالب علم میں ایسا شوق پیدا کر سکے جو اس کی زندگی میں علمیت اور جہالت کی تمیز کے ساتھ علمیت کی فضیلت اور زندگی میں ان کی مدد سے فیصلہ کرنا سکھادے اور علم کی قوت کو بروئے کار لائے۔ ہمارے معاشرے میں چوں کہ اطاعت بھی ایک اہم صفت اور خوبی ہے۔ اس لیے شاگرد بھی اساتذہ کی اطاعت ہی کرتے ہیں۔ مگر یہ اطاعت اور ادب طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور صلاحیتوں کی جلا میں رکاوٹ کا باعث نہ بنے اور کسی بھی طرح یہ استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ غلامی اور محکومی کا تاثر لیے ہوئے نہ ہو کیوں کہ بقول اقبال:

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئ مرگِ مفاجات

خواتین انسانی معاشرے کا ایک لازمی اور قابل احترام کردار ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں ظہورِ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب میں عورت کے لیے کوئی قابل ذکر حقوق نہ تھے۔ اسلام کے علاوہ سارے عالم میں عورت کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی دیگر مذاہب اور اقوام نے عورت کو کبھی پیچ مخلوق قرار دیا اور کبھی اسے فساد کی جڑ تصور کرتے ہوئے قابل نفرت سمجھا۔ خواہ وہ یونان ہو یا روم، عرب ہو یا عجم، یورپ ہو،

ایران ہو یا ایشیا ہر جگہ عورت مظلوم ہی رہی ہے یونانیوں کا کہنا تھا آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے، لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔ اسلام نے عورت کو ذلت اور غلامی کی زندگی سے آزاد کرایا اسے حقیقی آزادی، خود مختاری سے جینے کا حق اور ظلم و استحصال سے نجات دلائی اور معاشرے میں بلند مقام عطا کیا۔ انھیں تعلیمات کی روشنی میں اقبال بھی کہتے ہیں کہ کائنات کی تصویر میں عورت کی بدولت ہی رنگینیاں ہیں وہ ثریا سے عظیم تر ہے اور ہر شرف اس کے وجود کا چھپا ہوا موتی ہے:

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

''عورت کی حفاظت'' میں کہتے ہیں کہ:

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس حقیقت کو نہ پایا — اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

یہ وہ افکار ہیں جن سے معاشرے میں یہ روایت پنپتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے حقوق و فرائض کا شعور بھی رکھیں اور ان کی ادائیگی میں اپنا اپنا کردار بھی ادا کریں۔ جب تمام ذمہ داریاں اپنے اپنے طور پر ادا ہوں گی تو معاشرے میں ایک توازن قائم ہو گا۔

اقبال کے ہاں تربیت کی صورتیں:

کلامِ اقبال میں معاشرے کے جن افراد اور طبقات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ان کی تربیت اور کردار سازی کی مختلف صورتوں میں وہ اسلامی نظریات و اقدار کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ اقبال کے فکر و فلسفہ میں اسلامی نظریات و عقائد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ملت کی اساس توحید کو گردانتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی اس تعلیم اور تصور کو پیش کر کے ملتِ اسلامیہ کو وحدت کا سبق دیا۔ اقبال قرآن مجید کو نہ صرف مسلمانوں کے لیے رہبر و رہنما قرار دیتے ہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے رہنما و رہبر سمجھتے ہیں۔ قرآنِ مجید کو اقوامِ عالم کے ضعف کے لیے نسخہ کیمیا سمجھتے ہیں اور اس کائنات کے اندر انسان کی رہنمائی کے لیے اس سے اعلیٰ اور کوئی کتاب نہیں سمجھتے وہ جانتے ہیں کہ اس کتاب کی تعلیم نے امیر و غریب اور آقا و غلام کے امتیازات کو ختم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال وہ مفکر ہیں جنھوں نے قرآنِ مجید کی تعلیمات کو شعوری طور پر اپنے کلام میں شامل کیا۔ عقائد و معاملات سے لے کر اسلامی شعائر اور برگزیدہ ہستیوں تک تمام اہم واقعات اور

روایات کو کلام کی زینت بنایا۔ شخصیات کے حوالے سے دیکھیں تو حضرت آدمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اسی طرح جبریلؑ کا ذکر ملتا ہے۔ صحابہ کرام کی عظیم ہستیوں پر قلم اٹھایا۔ حرم، مدینۃ النبی، مسجدِ قرطبہ، حج، نماز، یدِ موسیٰ، جلوۂ طور کے نور سے دلوں کو منور کیا۔ یہ سب ملت کی تڑپ میں اور صحیح راستے پر گامزن کرنے مقصد سے کیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں اس قدر استدلال سے کام لیا ہے کہ کلام میں تاثیر اور دِلوں میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر دیا ہے:

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا — آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال کے نزدیک یقین و ایمان کا تعلق مذہب سے ہے۔ کوئی انسان جب تک ایمان کی دولت سے مالامال نہیں ہوتا وہ تشکیک کا شکار رہتا ہے اور منزلِ مقصود کو پانے سے قاصر رہتا ہے۔ زندگی کی معراج سے کوسوں دور رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت میں ایمان کی کمزوری اور بے یقینی نے بے عملی پیدا کر دی ہے۔ اس بے عملی کو حرکت و عمل میں تبدیل کرنے اور متحرک کرنے کے لیے عشق ہی کارآمد جذبہ ہے۔ عشق اقبال کے نزدیک وہ قوت ہے۔ جو سوزِ قلب اور جوشِ حرارت پیدا کرتی ہے۔ وہ بارگاہِ ایزدی سے ہمیشہ تڑپ اور روحانی بیداری کے متمنی رہے۔ وہ اپنی اس جستجوئے حقیقت کا خاتمہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اقبال حرکت و عمل، قوتِ ایمانی اور عشق کو اپنا کر ایک ایسے فرد کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ جو ان کا مردِ کامل ہے۔

اسلامی نظریات و افکار کے بعد حُبِ رسولؐ صحیح معنوں میں اقبال کی زندگی اور کلام کا حاصل اور ثمر ہے۔ محبتِ رسولؐ کی یہ کہکشاں جگہ جگہ کلامِ اقبال میں درخشاں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسی قوسِ قزح ہے جس کے انوار ہر طرف پھیلے ہوئے چمکتے دمکتے ہیں۔ اقبال یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ملت کے ہر فرد کے رگ و پے میں عشقِ محمدؐ سما جائے اور پھر یہ قوم سربلند ہو جائے۔ عشق اور حُب کی یہ قوت ملتِ مسلم کے ہر فرد میں اتنی جرات پیدا کر دے کہ وہ اس دنیا کے اندر محسنِ انسانیت حضرت محمدؐ کے تذکرے کو عام کر دے۔ گویا ہر انسان رسولِ اکرمؐ کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور اس دنیا کے اندر اسلام کا بول بالا ہو جائے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

حضورؐ سے عشق و محبت کی یہ ادا اقبال کو ہر لمحہ یادِ نبیؐ میں گم رکھتی ہے اور وہ بے قرار و مضطرب

رہتے ہیں۔ دن رات محبوبِ خداؐ کی یاد میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان حسین خیالات کی رو اقبال کو ''حضور رسالت مآبؐ میں'' جا پیش کرتی ہے۔ جہاں اقبال سچے اور صاف دل سے التجا کرتے ہیں کہ :۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

اسی طرح ضربِ کلیم کی ایک نظم ''اے روح محمدؐ'' میں خطابیہ انداز ہے اور اس میں کچھ سوالات اٹھاتے ہیں مگر بصد ادب و احترام عرضِ نیاز کرتے ہیں۔ ان سوالات میں امت کے مختلف تفرقوں کی دل گداز داستاں قلم بند کی ہے۔ مسلمانوں میں پیدا ہونے والے نفاق اور اتحاد کی کمی کو دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی فرقہ بندی اور گروہوں کی تقسیم پر تڑپتے ہیں اور چند گزارشات حضورِ اقدس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں :

شیرازہ ہوا امتِ مرحوم کا ابتر　　اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذتِ آشوب نہیں بحر عرب میں　　پوشیدہ جو ہے مجھ میں، وہ طوفان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد　　آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اس التجا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے لیے، امت کے لیے رہنما اور رہبر وہی ذاتِ پاک ہے۔ اس لیے اگر نبی کریمؐ سے وفا، محبت اور لگن کا حق ادا ہو گیا تو رب راضی ہو گیا اور سب مل گیا۔ اسی میں فلاح ہے۔ یہ دنیا بھی اور وہ دنیا بھی کیوں کہ :۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال کے نزدیک ایک اور خوبی اور صورت جو افرادِ معاشرہ میں پنپ کر انھیں کامیاب و کامران کر سکتی ہے وہ ہے آزادئ فکر۔ آزادئ فکر کی نمود کے لیے دراصل ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں پرورش پا کر ہر فرد کی انفرادیت کو جلا ملتی ہے۔ انفرادیت کی نشوونما انسان کے فطری جوہر کو تخلیق کا حسن بخشتی ہے اور پھر تخلیق تو وہ صفت ہے جو انسان اور اس کے خالق میں قدرِ مشترک ہے اور یہی صفت انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ انفرادی قوت کا مالک ہے اور تخلیق کی صلاحیت رکھتا ہے اگر اسے اپنے ماحول میں ایسی آزادی میسر نہیں تو تخلیق کے صفت مر جاتی ہے۔ اس آزادئ فکر کا مطلب ایک ایسی

آزادی ہے جو فہم و فراست کے لیے انتخاب کا دائرہ وسیع کرتی ہے انتخاب کی آزادی بھی صرف انسان ہی کو تفویض کی گئی ہے اور اسی صفت کی بدولت وہ انفرادیت قائم رکھ سکتا ہے اور یہ اس وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب وہ نیکی کا انتخاب کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس سطح پر اس کی عقلی استطاعت اتنی ہونی چاہیے کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ اقبال کا کہنا ہے:

> نیکی کے علاوہ منتخب کرنے کی بھی آزادی انسان کو حاصل ہے۔ اللہ نے انسان کو یہ آزادی دے کر اس پر بے انتہا اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس اعتماد کو آزادی کے دانش مندانہ اور مثبت استعمال سے یہ ثابت کرے کہ وہ اس اعتماد کے قابل ہے۔[6]

اقبال اپنے کلام میں یوں کہتے ہیں کہ :۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود ۔۔۔ کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے ۔۔۔ اس آب جو سے کیے بحرِ بے کراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے ۔۔۔ جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مغلوب تہذیب غالب تہذیب کے افکار کا تجزیہ کیے بغیر اگر چند مفروضات کو قبول کرلے تو مغلوب تہذیب میں ذہنی اور عقلی تضادات جنم لیتے ہیں جو مزید انتشار کا باعث بنتے ہیں۔ اس کا ہر گز مطلب نہیں کہ دوسری تہذیبوں کے افکار کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی تہذیب علمِ کل کی مالک نہیں ہوتی۔ علم کا حصول ایک جاری و ساری عمل ہے۔ علم کی کوئی جغرافیائی حدود بھی نہیں ہوتیں بلکہ ایک تہذیب دوسری تہذیب کے علم و فن سے فائدہ حاصل کر کے ارتقاء میں سبقت لینے کی کوشش کرتی ہے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ آپ کے لیے دوسری تہذیبوں کا تنقیصی جائزہ ضروری ہے تاکہ ان افکار کو اپنایا جائے جو ارتقاء کا سبب بن سکیں اور قوم کو انتشار سے محفوظ رکھیں۔ قوم کے دانشور افراد کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ تجزیاتی اور تنقیصی مطالعہ کا فرض معروضی اور منصبی طور پر سرانجام دے سکیں نظام تعلیم میں اس کی پوری سہولتیں ہونی چاہئیں جن کے بغیر موافق اور ناموافق کی پہچان ممکن نہیں۔

اقبال اپنی دوررس نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب جو آج انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہی ہے۔ دنیا کے لیے مفید نہیں۔ وہ روحانیت کو افسردہ کرتی ہے۔ وہ مادیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کا انحصار محض علم و دانش پر ہے۔ دانیانِ فرنگ کی آنکھیں روشن ہیں لیکن دل بجھے ہوئے ہیں اور روحیں سو

رہی ہیں۔ ان کے قلب سوزِ دل سے عاری ہیں وہ دورِ حاضر کے علوم و فنون کی ترقی میں روحانیت کے زوال کو دیکھتے ہیں۔ یہ ترقی نہیں تباہی ہے۔ یورپ کی آزادی کی بلند آہنگیاں حقیقت میں غلامی کی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں۔ سائنس کی روز افزوں ترقی نسل انسانی کی فلاح اور بہبود کے لیے نہیں بلکہ تباہ کار آلاتِ حرب کی ساخت کے لیے ہے۔ نئی تہذیب کی یہ خوش منظر عظیم الشّان عمارت نہایت سست بنیاد ہے۔ اس کی تعمیر ہی میں بربادی مضمر ہے۔ اقبال ان تمام غیر محسوس اثرات کو دیکھتے ہیں اور ایشیا والوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ میں وہ کہتے ہیں:

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی　　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

در حقیقت اقبال وہ عظیم پیام بر ہیں جنھوں نے قوم کے ہر ہر فرد کو اہم اور مقدم سمجھتے ہوئے اس کی تربیت و کردار سازی کے لیے خونِ جگر نچھاور کیا۔ کلامِ اقبال دنیا کے ہر حصے میں پڑھا جاتا ہے اور مسلمانانِ عالم بالخصوص اسے بڑی عقیدت کے ساتھ زیرِ مطالعہ رکھتے ہیں۔ اقبال نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی اور اسلامی عظمت کو اجاگر کیا، ان کی کئی کتابوں کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، چینی، جاپانی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور اس دور میں مسلم امہ میں موجود مایوسی کے باوجود وہ روشن مستقبل کی توقعات کا اظہار جس انداز سے کرتے ہیں وہ مسلمانوں میں حریت، بیداری اور اُمید پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایمان و عمل کی قوت اور سرشاری پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی دو رائے نہیں کہ اگر ہم آج پنے نوجوانوں اور قوم کے افراد کو افکارِ اقبال سے روشناس کرائیں تو کامیابی و کامرانی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، منتشرِ خیالاتِ اقبال (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ء)، ۳۱۔
۲۔ ڈاکٹر عبد المغنی، تنویرِ اقبال (لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت اردو بازار، ۱۹۹۰ء)، ۱۳۱۔
۳۔ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، اقبال کی پائندہ یادیں (لاہور: نشریات، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، ۲۰۱۷ء)، ۱۰۶۔
۴۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، منتشرِ خیالاتِ اقبال، ۸۹۔
۵۔ ایضاً، ۱۰۰۔
۶۔ سید نذیر نیازی، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۱ء)، ۶۸۔